R. No. 2100/57

Regd. No. A. 920

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

Telephone No. 29

Telegrams "ANJUMAN"

جلد ۲۱ - شمارہ ۴۳ | ایڈیٹر آل احمد سرور | علی گڑھ ۱۵ نومبر ۱۹۶۲ء

[illegible]

یہ چند ہم عصر

سید امجد علی اشہری مرحوم نے ۱۹۱۸ء میں، جب کہ ان کی عمر پچاس سے کچھ اوپر تھی، عمومی تذکرے کے طور پر کوئی ڈیڑھ سو صفحے کی ایک کتاب "ایشیائی شاعری" کے نام سے لکھی تھی جو مطبع آگرہ اخبار سے شائع ہوئی تھی۔ اس کتاب کے آخری حصے میں ۱۸۷۱ء سے ۱۹۱۸ء تک اشہری نے اپنے ان ہم عصر شعرا اور ادبا کے حالات دیے ہیں جنھیں دیکھنے یا ملنے کا موقع ملا۔ ان معاصرین میں ان کے بزرگ بھی ہیں، بزرگوں کے بزرگ بھی، اور ہم عمر بھی۔ چشم دید اور گوش شنید معاصرین کا یہ تذکرہ اس اعتبار سے تو بڑی اہمیت رکھتا ہی ہے کہ یہ بیانات ایک ہم عصر کے قلم سے ہیں، اس کی اہمیت یہ بھی ہے کہ اکثر بیانات معلومات میں کچھ نہ کچھ اضافہ ہی کرتے ہیں۔

میں نے غیر ضروری اندراجات چھوڑ کر اہم بیانات نقل کر دیے ہیں۔ امید ہے یہ تذکرہ دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔ اس تذکرے میں انیس، دبیر، غالب، ناظم، نواب تسلیم، جلال، تسلیم سہسوانی، امیر مینائی، اوج، داغ، حالی، ریاض، مضطر، شوکت، خلق اور میر شکوہ آبادی شامل ہیں۔ (بیدار)

میری عمر پچاس سال سے متجاوز ہے۔ میں ۱۳۳۶ھ مطابق ۱۹۱۸ء میں یہ کتاب لکھ رہا ہوں۔ میں نے اپنی عمر میں جن شعرا کو دیکھا یا سنا، اُن کی ہم بزمی کا اتفاق ہوا یا میں نے ان کو اپنی عمر کے طبقۂ اعلیٰ کے افراد میں پایا، اُن کے نام نامی و اسمائے گرامی سے اس کتاب کو عزت دیتا ہوں۔۔۔

میر انیس

۔۔۔ میر صاحب کا کلام مطبع اودھ اخبار لکھنؤ نے چھوٹی چھوٹی تین جلدوں میں شائع کیا ہے لیکن ابھی بہت بڑا حصہ شائع ہونے سے باقی ہے۔ کاش کوئی مطبع میر صاحب کی رباعیات، سلام، مراثی کو فراہم کر کے شاہنامہ جیسی شاندار کتاب مرتب کرے اور اس کی تدوین خاص اہتمام سے کی جائے تو ایک بہت بڑا فرض ادا کرنے والا ہو سکتا ہے۔ میں نے میر انیس غفران مآب کو دو مرتبہ دیکھا اور ان کی زبان سے مجلس میں یہ مرثیہ سنا ہے: "جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے"

میں نہیں کہہ سکتا کہ میں نے اپنی تمام عمر میں میر انیس سے زیادہ کسی کو فصیح البیان پایا ہو۔ اس میں کچھ مبالغہ نہیں کہ میر انیس کے تحت اللفظ پڑھنے میں ان کی خوش بیانیاں وہ لطف پیدا کرتی تھیں جو صرف ان کا حصہ مانا جاتا ہے۔ ہر سال عظیم آباد میں محرم کی مجلسیں پڑھنے تشریف لے جاتے تھے۔ ہزاروں روپیہ اس قسم کی نذر و نیاز سے ملتا تھا۔ ایک مرتبہ سالار جنگ نے حیدر آباد میں طلب کیا تھا وہاں تیرہ روز رہے۔ سر سالار جنگ نے تیرہ ہزار پیش کش کیے۔ اور سر آسماں جاہ بہادر نے چاہا کہ میر صاحب منبر پہ ٹوپی پہن کر بیٹھنے کی جگہ حیدر آباد کی منصبداری پگڑی رکھ کر بیٹھیں تو ایک مجلس کے دس ہزار پیش کش کیے جا سکتے ہیں مگر میر صاحب نے کہا کہ میں اہل بیت کے دربار میں جس وضع سے حاضر ہوتا ہوں اس کے خلاف گوارا نہیں کر سکتا اور آخر کار دس ہزار چھوڑ دیے مگر اپنی ٹوپی کا منصبداری پگڑی کے عوض میں سر سے اتارنا قبول نہ کیا۔

میرزا دبیر

میر انیس کو اردو کا فردوسی کہیں تو میرزا دبیر کو اردو کا خاقانی کہنے میں کچھ تامل نہ کرنا چاہیے۔ میرزا دبیر نے مرثیہ کہنا اہل بیت اطہار کے جوش تولا سے اختیار کیا۔ وہ ایک سید کے احترام میں ایسی فروتنی ظاہر کرتے تھے جو اس زمانہ میں کمیاب ہے۔ میرزا صاحب کو عربی کے ادب اور عقائد کی کتابوں سے خاص دلچسپی تھی اور فارسی کی اعلیٰ

تصنیفات بھی بیشتر زیر نگاہ رہتی تھیں۔ اسی لئے عربی و فارسی کی ترکیبات اور شکوہِ کلام نے ان کی شاعری میں ایک خاص طور کی آمد اور آورد کو جگہ دی تھی وہ اردو کے لفظوں میں عربی اور فارسی کے بڑے بڑے مطالب لانا چاہتے تھے اور اسی لئے ان کو بعض جگہ تعقید کی پروا نہ ہوتی تھی کیونکہ وہ تعقید کے لحاظ سے ایک اعلیٰ مضمون کا چھوڑنا نہ چاہتے تھے۔ میرزا دبیر کے کلام سے بے انتہا اعلیٰ مطالب کا اقتباس کیا جا سکتا ہے میرزا صاحب کی تصنیف کا صحیح شمار معلوم نہیں مگر میر انیس کے ساتھ ساتھ ان کو بھی دیکھنا چاہئے۔ میرزا دبیر کے کثیر مراثی اور سلام اور رباعیات میں سے تین جلدیں چھپ کر شائع ہوئی ہیں۔ کاش کلام ایک جگہ جمع کر لیا جائے تو اردو شاعری کا ایک قابل قدر ذخیرہ ہو سکتا ہے۔ راقم کو بزمانۂ قیام لکھنؤ اکثر میرزا صاحب سے حصول نیاز کا موقع ملا ہے۔ میرزا دبیر کا انتقال میر انیس کے بعد ہوا۔

غالب

مجھ کو دلّی کی آبادی اور شاعری کی دنیا میں ایک مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ کا دیکھ لینا دلّی و سودا سب کو دیکھ لینے کے برابر ہے بسنہ ۱۲۸۵ھ میں میں نے حضرت میرزا صاحب کو الٰہ آباد میں بابو بینی پرشاد صاحب وکیل ہائی کورٹ کے دیوان خانے میں دیکھا تھا ان کی شیوا بیانیوں سے بھی مستفیض ہوا۔ اس وقت میری عمر سترہ اٹھارہ برس کی تھی اور میں بھوپال میں ملازم تھا جناب نواب سکندر بیگم صاحبہ خلد نشین والیہ سابق ریاست بھوپال نے بہت چاہا کہ حضرت میرزا صاحب بھوپال تشریف لائیں اور یہیں قیام فرمائیں، مگر میرزا سے دلّی چھٹنا مشکل تھا۔

میرزا غالب کا اُردو دیوان شاعری کی جان ہے۔ اگر اُردو میں شاعری کی صورت نظر آ سکتی ہے تو میرزا غالب کے دیوان میں۔ مگر اس کا سمجھنا معمولی بات نہیں۔ اس لئے مولانا شوکت کے حل غالب سے مشکل کشائی کا کام لینا چاہئے۔ میرزا غالب فارسی کے شاعر ہیں اور ان کا فارسی کلام نہ صرف ہندوستان بلکہ ایران میں استادانہ درجہ رکھتا ہے۔ مگر دلّی کی بود و باش اور شاعری کے حقیقی مذاق نے اُن کی اُردو شاعری پر جو اثر کیا وہ میرزا غالب اور صرف میرزا غالب کا حصہ ہے وہ اُردو شاعری میں اپنی وضع کے آپ موجد ہیں۔ اور آپ خاتم۔ حکیم مومن خاں اور اُستاد ذوق اُن کے مشہور اور مستند ہمعصر ہیں۔ لیکن میرزا غالب کا کمال فن اور چیز ہے۔

بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری

نواب یوسف علی خاں ناظم

طبقۂ اعلیٰ میں نواب یوسف علی خاں بہادر متخلص بہ ناظم فرمانروائے سابق رامپور کا کلام متانت اور امیرانہ خیال کو خاص طور سے ظاہر کرتا ہے اور نواب صاحب ممدوح کو میرزا غالب سے خاص عقیدت تھی۔ نواب یوسف علی خاں کا دیوان اس طبقے کی تصنیفات میں اُردو کا سرمایۂ افتخار ہے

نواب کلب علی خاں بہادر

رامپور کے دوسرے فرمانروا نواب کلب علی خاں بہادر جن کا نام نامی اہل کمال کی قدر دانی میں شہرۂ آفاق ہے۔ شاعری کا خاص مذاق رکھتے تھے۔ اور امیر، داغ، جلال، منیر جیسے باکمال شعراء کی ہم بزمی نے ان کے مذاق پر اور صیقل کر دی تھی۔ نواب تخلص فرماتے تھے۔ نواب موصوف کی تصنیف سے کئی دیوان یادگار ہیں۔ حضور ممدوح نے اپنی تمام تصنیف جناب منشی امیر احمد صاحب امیر مینائی کے ذریعہ سے راقم ہیچمداں کو عنایت فرمائی تھی جبکہ راقم بھوپال میں نائب مرافعہ تھا۔ نواب موصوف کے دواوین اُردو کے محاورات اور روزمرہ کی بول چال اور شاعری کی ترکیبات بندش کا خاص چربہ ہے۔

تسلیم

منشی امیر اللہ تسلیم سے رامپور میں ملا ہوں اور جناب تسلیم کا کلام ان کی زبان سے سنا ہے۔ اب سن شریف قریب ستر برس کے ہوگا۔ اُردو میں صاحب دیوان ہیں، اور مثنوی شام غریباں آپ کے ادائے سخن کا بہترین نمونہ ہیں۔ نسیم دہلوی کے شاگرد ہیں۔

انوار حسین صاحب تسلیم

منشی انوار حسین صاحب تسلیم سہسوانی کو فن تاریخ گوئی میں ید طولیٰ حاصل تھا چنانچہ آپ نے اقسام تاریخ پر ایک مستقل کتاب لکھی ہے اور یہ کتاب مطبع نیر اعظم مراد آباد میں چھاپی گئی ہے میں نے لکھنؤ میں دیکھا تھا۔

جلال لکھنوی

لکھنؤ کے مشہور شاعروں میں سے ہیں۔ نواب کلب علی خاں فرمانروائے سابق رامپور کی قدر شناسی نے ان کو اپنے دربار میں جگہ دی تھی۔ جناب داغ بھی ان کو مانتے ہیں۔ علم عروض میں دوسروں سے ممتاز ہیں۔ دیوان جلال چھپ چکا ہے۔ کلام میں سلاست کے ساتھ متانت استادی لئے ہوئے ہے۔ راقم نے دیکھا انہیں کلام سے لطف سخن اُٹھایا ہے۔

امیر مینائی

میں نے حضرت منشی صاحب کو رامپور اور بھوپال میں دیکھا اور آخر میں اُس قدسی پیکر کی حیدر آباد میں زیارت کی ہے۔ ایک زمانہ میں خطوط کا سلسلہ بھی جاری تھا۔

منشی صاحب کا کلام غزل قصیدہ دونوں میں اُن کا کمال ظاہر کرتا ہے۔ تین دیوان منشی صاحب کے چھپ چکے ہیں۔ ان میں ایک دیوان نعت جناب سرور کائنات میں ہے۔ اُردو کی دنیا میں کسی کا کلام نعت اس مرتبہ کا نہیں۔ شاعری کے علاوہ منشی صاحب نے ایک لغات کی تدوین میں اپنی وسعت معلومات کا اظہار کیا۔ جو حصہ لغت کا چھپ کر شائع ہو چکا ہے وہ آپ ہی اپنا نظیر سمجھا جاتا ہے۔ اور انگلستان کی علمی سوسائٹی میں بھی اس کو قبولیت خاص کا درجہ حاصل ہے۔ چنانچہ مسٹر آر برن نے جن کی کئی پشتیں ہندوستان کی خدمات میں گزریں اپنی عالمانہ تحقیقات کے متعلق اپنی تصنیف میں منشی امیر احمد صاحب مینائی اور ان کے قابل قدر امیر اللغات کا ذکر کیا ہے۔ مسٹر برن یہ بات چاہتے ہیں کہ یہ لغات مکمل ہو جائے اور اس نظر سے وہ یہ رائے دیتے ہیں کہ انجمن ترقی اُردو نواب صاحب بہادر رامپور کو جن کی فیاضانہ امداد سے یہ کام کیا گیا تھا اپنی خدمات اس کام کے واسطے تفویض کرے۔ وہ کہتے ہیں کہ نہایت افسوس کا مقام ہو گا کہ باقی ماندہ کتاب نہ چھپائی جائے۔

(دیکھو انسٹی ٹیوٹ گزٹ علی گڑھ ۔ ۲۵ر جولائی ۱۹۰۳ء)

(باقی صفحہ ۱۱ پر)

ہماری زبان

۱۵ر نومبر ۱۹۹۲ء

عقیدہ اور عمل

ہر کام میں سب سے پہلے ایک مضبوط عقیدے کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ عقیدہ ایک بنیاد ہے جس پر عمل کا شاندار محل تیار ہو سکتا ہے۔ بغیر عقیدے کے عمل کی جو عمارت بنائی جاتی ہے وہ ریت پر تعمیر کے مترادف ہے۔ کبھی انسان جوش میں آکر، کسی خاص جذبے کے تحت، روایت کی وجہ سے، وضعداری کے تقاضے پر، دوسروں کی دیکھا دیکھی بہت کچھ کر بیٹھتا ہے، مگر پھر ذرا سی مخالفت، ذرا سی رکاوٹ، ذرا سی دقت سے بتاشے کی طرح بیٹھ جاتا ہے۔ جوش میں اُبھرنے اور ذرا سی مخالفت کے بعد پچک جانے کی وجہ سے اُسے دُنیا سے ایک شکایت ہو جاتی ہے۔ وہ صاف صاف دُنیا کو بُرا بھلا نہیں کہہ سکتا، تو اپنوں کی خبر لیتا ہے۔ اپنے بھی برداشت نہیں کر سکتے تو اپنی ذات پر ہاتھ صاف کرتا ہے، یعنی ہر چیز سے بیزار ہو جاتا ہے، اور اپنے آپ کو حق و صداقت کی وہ شمع سمجھنے لگتا ہے جسے زمانے کی تند ہواؤں اور اپنوں اور بیگانوں کی بے رحمی اور چیرہ دستی نے بجھا دیا ہو۔

لیکن عقیدہ ایسے حوادث سے محفوظ رکھتا ہے۔ عقیدہ تلوار بھی ہے اور سپر بھی، وہ غذا بھی دیتا ہے اور خون بھی دوڑاتا ہے۔ عقیدہ عمل کے لئے طاقت فراہم کرتا رہتا ہے۔ راہ کے کانٹے نکالتا ہے، یا تو مخالفتوں سے بچنے کا راستہ سجھاتا ہے یا مخالفتوں پر قابو پانا سکھاتا ہے۔ عقیدے کی پختگی صحت مند نگاہ پیدا کرتی ہے۔ وہ دوسروں کی بے پروائی کو بے حسی نہیں سمجھتی۔ وہ حالات پر نظر رکھتی ہے مگر حالات کی غلام نہیں ہوتی۔ وہ وقت کے دریا میں تنکے کی طرح بہنے سے روکتی ہے اور تیز سے تیز دھارے کو رفتہ رفتہ اپنی مرضی کے مطابق موڑنے یا اس کی شدت کو کم کرنے میں کامیاب ہوتی ہے۔

مثلاً اگر ہمارا عقیدہ اپنے وطن میں مضبوط ہے تو ہم ذرا سی غفلت یا کوتاہی پر واویلا نہیں مچاتے، سراسیمہ نہیں ہوتے، قربانی کے لئے بکرے نہیں تلاش کرتے، مگر غلطی کو سمجھ کر اپنی اصلاح کر لیتے ہیں اور آگے بڑھتے ہیں۔ اگر وطن اور قوم پر عقیدہ مضبوط ہے تو اس قوم کے کسی فرد یا کچھ افراد کسی وجہ سے قوم کی اکثریت سے بدظن نہیں ہوتے، بلکہ یہ سمجھتے ہیں کہ یا تو ہماری بات واضح طور پر کہی نہیں گئی یا کچھ کے راستے میں کچھ دشواریاں حائل ہیں، یا ہماری بات میں کچھ کمزوری رہ گئی ہے جسے دور کرنا ہے۔ اُردو دوستوں کو ان باتوں پر غور کرنا چاہئے۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہندوستان میں اُردو کا مستقبل تاریک ہے ان سے ہمیں کچھ کہنا نہیں ہے۔ کیونکہ ہم سمجھتے ہیں کہ جب ہندوستان کا مستقبل روشن ہے تو ہر قومی زبان کا بھی روشن ہے اور چونکہ اُردو بھی ایک قومی زبان ہے اس لئے اس کا مستقبل کیسے تاریک ہو سکتا ہے۔ ہاں یہ ضرور سوچنا چاہئے کہ کیا اُردو زبان کا ہمارا تصور اُنیسویں صدی کی زبان کا ہے یا بیسویں صدی کی زبان کا۔ اُنیسویں صدی کی زبان سے بیسویں صدی فیض حاصل کر رہی ہے، مگر اس میں اضافہ بھی کر رہی ہے گو اس اضافے کو کچھ لوگ کتنا ہی بُرا سمجھیں۔ بیسویں صدی ہر زبان کو اپنے نقطۂ نظر سے دیکھے گی۔ وہ اس کے لئے اُنیسویں صدی یا اٹھارویں صدی کا نقطۂ نظر کہاں سے لائے۔ ہندوستان بھی اُردو یا ہندی یا گجراتی یا مراٹھی کے اُسی روپ کو گلے سے لگائے گا جو اس کی آج کی زندگی، اور اس کی ضروریات کا ساتھ دے سکتی ہے۔ ہر زبان میں اس کی صلاحیت پوشیدہ ہوتی ہے، مگر اس پوشیدہ صلاحیت کو بروئے کار لانے کے لئے مناسب تدابیر اختیار کرنی ہوتی ہیں۔ ہمیں بھی اُردو کے لئے بیسویں صدی کی ضروریات کو پیش نظر رکھنا پڑے گا۔ پھر یہ بھی ملحوظ رکھنا پڑے گا کہ دراصل ہر زبان اپنے بولنے والوں کے عقیدے کو پختہ رکھنے اور اُن کی ضروریات کے لئے ذہنی، نفسیاتی، روحانی جمالیاتی غذا مہیا کرتے رہنے کی صلاحیت کی وجہ سے اہم ہوتی ہے۔ اُردو بھی اسی وجہ سے اہم ہے۔ یہ اردو بولنے والوں کے نشو و نما کا واحد راستہ ہے۔ اس میں مدد دوسرے راستوں، دوسری زبانوں سے مل سکتی ہے مگر کوئی اور راستہ اس کا بدل نہیں ہو سکتا۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو اُردو دوستوں کو نہ صرف اپنا کام خود کرنا ہے، بلکہ اپنے کام کو قومی یکجہتی اور وطن کی ترقی کے لئے ضروری بھی ثابت کرنا ہے اور جو لوگ ناسمجھی یا ناواقفیت کی وجہ سے اس بات کو نہیں مانتے، انھیں تنگ نظر یا متعصب کہنے کے بجائے ان کو اپنی بات صاف، واضح، مدلل اور مضبوط دلائل کی مدد سے سمجھانی پڑے گی۔ یہ بات مشکل ہے، مگر ہمیں کرنا ہی ہے، جو لوگ اس راستے پر چل رہے ہیں اُن کو بُرا کہنے سے کام نہیں چلے گا۔ اُن کی کوتاہیاں تو ضرور بتانا چاہئیں، مگر ان کی نیت پر حملہ نہیں کرنا چاہئے۔ اُردو دوستوں کو اپنی زبان کی بنیادی اہمیت پر عقیدہ رکھتے ہوئے، حالات کو اپنے لئے سازگار بنانا ہے اور اس کی صورت یہ ہے کہ وہ ملک و قوم کے لئے اس کی اہمیت ثابت کریں اور آج کی زندگی میں قدم قدم پر اس کی ضرورت منوائیں۔ ہمارا ایمان ہے کہ اُردو یہ کام کر سکتی ہے اور کر رہی ہے۔ اس ایمان میں زیادہ سے زیادہ لوگوں کو شریک رکھنے کی جد و جہد جاری رہے گی، گو کچھ لوگ اسے خاموشی یا بے عملی سمجھیں۔ عمل کے راستے ہنگامے اور نمائش سے دور رہ کر بھی طے کئے جا سکتے ہیں۔

پنجاب میں اُردو
حکومت پنجاب کی وضاحت

جنرل سکریٹری انجمن ترقی اُردو (ہند) علی گڑھ نے لسانی اقلیتوں کے کمشنر کی وساطت سے حکومت پنجاب کو پنجاب میں اُردو بولنے والی اقلیت کی شکایات کی طرف توجہ دلائی تھی اس کے جواب میں حکومت پنجاب کے ایگزیکٹیو کمشنر اور ایگزیکٹیو سکریٹری کی حسب ذیل چٹھی موصول ہوئی ہے!

پنجاب میں اردو بولنے والی اقلیت کی عرضداشت کے متعلق آپ نے ۱۰ اکتوبر ۱۹۶۲ء کو جو چٹھی لکھی تھی اس کے جواب میں مجھے آپ کو یہ بتلانے کی ہدایت کی گئی ہے کہ پنجاب کی ریاستی سرکار نے طے کیا ہے کہ جن طالب علموں کی مادری زبان اُردو ہے، ان کی کافی تعداد اگر کسی اسکول یا کسی جماعت میں موجود ہو تو وہاں ابتدائی اور ثانوی درجوں میں اردو زبان میں تعلیم دینے کا انتظام کیا جائے۔ جہاں تک درسی کتابوں کا تعلق ہے وہ مادری زبان میں تعلیم دینے کے پیچر فارمولے کے دوسرے اور تیسرے حصے کے مطابق وہی ہوں گی جو ابتدائی اور ثانوی درجوں میں پنجابی اور ہندی کے نصاب میں شامل ہیں۔ چنانچہ کسی اسکول کے ابتدائی درجوں میں کم از کم چالیس یا ہر درجے میں دس دس طالب علم اردو کے ذریعے تعلیم حاصل کرنا چاہیں گے، تو ان کو اُردو میں تعلیم دینے کا انتظام کیا جائے گا۔ اسی طرح کسی اسکول کے ثانوی درجوں کے طالب علموں کی مجموعی تعداد کا ایک تہائی حصہ اُردو کے ذریعے تعلیم حاصل کرنے کی درخواست کرے گا تو وہاں بھی اُردو میں تعلیم دینے کا اہتمام کیا جائے گا۔

انجمن ترقی اُردو (ہند) علی گڑھ کے جنرل سکریٹری کی اس شکایت کا جہاں تک تعلق ہے کہ ریاستی لسانی شعبہ اُردو ادیبوں کو کم انعام دیتا ہے، یہ واضح کیا جاتا ہے کہ انعام دیتے وقت پنجابی، ہندی اور اردو ادیبوں میں کسی قسم کی تفریق نہیں کی جاتی۔ ریاستی سطح پر ہر سال ان تینوں زبانوں کے ایک ایک مصنف کو گیارہ گیارہ سو روپے کی تھیلی اور خلعت عطا کی جاتی ہے۔ اسی طرح پانچ ہزار کی رقم سال کی بہترین کتابوں پر برابر برابر تقسیم کی جاتی ہے۔ نیز مستحق ریاستی مصنفوں اور کلاکاروں یا ان کے خاندانوں کو پنجاب اسٹیٹ رائٹرس فنڈ سے مالی امداد بھی دی جاتی ہے۔

کل ہند اُردو کانفرنس جے پور کا التوا

انجمن ترقی اُردو راجستھان۔ اور کل ہند اُردو کانفرنس کی استقبالیہ کمیٹی، مالیاتی کمیٹی، نمائش کمیٹی، مشاعرہ کمیٹی، پنڈال کمیٹی، قیام و طعام کمیٹی وغیرہ کے عہدیداروں نے بالاتفاق حسب ذیل تجویزیں پاس کی ہیں۔

۲۴ اور ۲۵ نومبر ۱۹۶۲ء کو منعقد ہونے والی کل ہند اُردو کانفرنس جے پور چین کے جارحانہ اقدامات کے پیش نظر قومی دفاعی سرگرمیوں میں اپنی دلی خواہش سے حصہ لینے اور تمام تر توجہات اُس طرف مرکوز کرنے اور عملی شرکت کرنے کی بنا پر ملتوی

کی جاتی ہے جس کی مرکزی انجمن نے بھی ہدایت کی ہے۔

انجمن ہذا اپنی علمی و ادبی سرگرمیاں پس پشت ڈال کر ہر دفاعی خدمت کے لئے اپنے لائق ہر امکانی امداد کرنے اور دشمن کا استیصال کرنے کے سلسلے میں ہر اس خدمت کے لئے جو اس سے لی جائے اپنی آمادگی کا اظہار کرتی ہے اور اپنی خدمات پیش کرتی ہے۔

انجمن ہذا دشمن کے اس جارحانہ اقدام کی پُر زور مذمت کرتی ہے اور اس کی اس احسان فراموشانہ و قابل شرم حرکت کو قابل ملامت قرار دیتی ہے۔

انجمن ہذا اپنے نہایت محدود و قلیل ترین ذرائع آمدنی کے باوجود مبلغ ایک سو ایک کی رقم بطور ٹوکن قومی دفاعی فنڈ میں فوری پیش کرتی ہے۔

تجویز نمبر (۲)

انجمن ترقی اُردو راجستھان اور کل ہند اُردو کانفرنس سے متعلق مختلف کمیٹیوں کے عہدیداران بالاتفاق طے کرتے ہیں کہ جن اصحاب نے کانفرنس مذکور کے انتظامات کے لئے بحیثیت سرپرست یا معاون مالی امداد فرمائی ہے ان کو نام بنام اور دیگر متعلقہ صاحبان کو مجموعی طور پر شکریہ کے ساتھ مطلع کیا جائے کہ ان کی عطیہ رقوم پوری ذمہ داری کے ساتھ بالکل محفوظ ہیں، اور ان کا تا تاریخ حساب بالکل مکمل ہے۔ اور یہ عطیات وقت انعقاد کانفرنس ہی صرف ہوں گے۔ اور امید ہے کہ اب کانفرنس حالات کے سازگار ہونے پر منعقد ہوگی جس کو بالفاظ دیگر یوں کہنا بے جا نہ ہوگا کہ چونکہ ہماری فتح یقینی ہے اس لئے ہماری کانفرنس کے انعقاد کے وقت ہمارے دل ہماری فتح کی مسرت سے بھی معمور ہوں گے۔

واضح رہے کہ تجویز نمبر ایک میں ذکر کردہ رقم کا کوئی تعلق کانفرنس سے متعلق عطیات سے نہیں ہے بلکہ رقم مذکور ارکان انجمن وغیرہ کی ہنگامی و فوری پیش کش ہے۔

تجویز نمبر (۳)

اجلاس ہذا طے کرتا ہے کہ جن ناشرین یا مصنفین نے ازراہ مہربانی اپنی کتابیں بھیجی ہیں وہ کتابیں بصد شکریہ ان کو واپس کر دی جائیں۔

انجمن ترقی اُردو شاخ ساگر

انجمن ترقی اُردو ساگر کی مجلس عاملہ نے بالاتفاق رائے چینیوں کے اس شرمناک جارحانہ حملے کی سخت مذمت کرتے ہوئے شاعروں، ادیبوں، صحافیوں سے اپیل کی ہے کہ وہ دشمن کو شکست دینے میں اپنی پوری صلاحیتیں صرف کریں۔

انجمن ترقی اُردو پنجاب

انجمن ترقی اُردو پنجاب کے ایک جلسہ عام میں چینی حملے کی مذمت کرتے ہوئے بھارت سرکار کو یقین دلایا گیا ہے کہ ہم لوگ تن من اور دھن سے بھارت ماتا کی حفاظت کریں گے۔ اسکی حفاظت میں آخری قطرہ خون بھی بہانے سے دریغ نہ کریں گے۔

صلاح الدین نیّر

چراغِ عزم

اٹھل پتھل رقص میں ہے سیک بارہ بن کے کناروں پر
اندھیروں نے کمندیں پھینک دی ہیں پھر اجالوں پر
کہیں ایسا نہ ہو پھر آنچ آ جائے بہاروں پر
مگر جب تک بھی ہم زندہ ہیں قدرِ زندگی ہوگی
چراغِ عزم روشن ہے برابر روشنی ہوگی

ہوس ہے ملک گیری کی نگاہِ امن دشمن میں
لگائی جا رہی ہے آگ ہندستاں کے دامن میں
کہیں ایسا نہ ہو مرجھائیں سارے پھول گلشن میں
ہمالہ، تاج، ایلورہ، اجنتا کے نگہبانو!
بہت باریک بیں ہے اس نئے دشمن کو پہچانو!

نظر اٹھے گی پھولوں پر تو کانٹے راہ روکیں گے
چمن کی تازگی کے واسطے دل کا لہو دیں گے
ہم اپنے جذبۂ حُبِّ وطن سے کام لے لیں گے
وہ دن نزدیک ہے ہوگا چراغِ سرکشی مدھم
شعورِ وقت کے ہاتھوں میں ہوگا امن کا پرچم

لگی ہے ضرب کاری آج ہندستان کے دل پر
عداوت دشمنی کا جال سا پھیلا ہے ساحل پر
مگر ہم گرد رہ جمنے نہ دیں گے اپنی منزل پر
ہمارا عزم طوفاں ہے جو اس کی زد میں آئے گا
سمندر تو سمندر ہے زمیں میں ڈوب جائے گا

حق و ناحق کا جب بے ربط رشتہ ٹوٹ جائے گا
ہوس کا جام دستِ چیں سے خود چھوٹ جائے گا
ربابِ امن کے سازوں سے نغمہ پھوٹ جائے گا
سحر ہوگی نئے سورج کی کرنوں میں نہائیں گے
ہم اپنے خون کا ایک ایک قطرہ تک بہائیں گے

"بلا کوؤں" کے نرغے میں جو ناموسِ وطن ہوگی
اگر تاراجی برگ و گل و سرو و سمن ہوگی
اگر برباد ہندستاں اپنی صحنِ چمن ہوگی
نگر کی روشنی کیا ہے دلوں کا خون بھی دیں گے
گلوں پر گر نہ ہو شبنم تو پلکوں کی نمی دیں گے

اجل بھی زندگی کے نام سے شرمندہ ہو جائے
شہیدانِ وطن کا نام پھر سے زندہ ہو جائے
جبینِ کشورِ ہندوستاں تابندہ ہو جائے
ہم اپنا خون دے کر وقت کی تاریخ بدلیں گے
شعورِ زندگی کیا ہے متاعِ زندگی دیں گے

لہو سے اپنے چمکائیں گے ہم تاریک راہوں کو
چنیں گے اپنی پلکوں سے تری راہوں کے کانٹوں کو
سمیٹ لیں گے ہم اپنے بازوؤں میں ان پہاڑوں کو
ترے دامن پہ اے ارضِ وطن! دھبہ نہ آئے گا
ترے قدموں میں ہم ایک ایک دم ٹوٹ جائے گا

ایس رسول چرتھی ردولوی

چراغِ آخرِ شب

اونگھتے پیڑ؟
نیند کے ماتے
خامشی دور تک بیاباں کی
سہمی سہمی ہر ایک راہ گذار
جیسے عفریت رقص کرتے ہوں

سیکڑوں سال سے غلامی کا
اپنے سینے پہ بوجھ اٹھائے ہوئے
اپنے ماضی کی داستاں کہتے
جانے کیا آج ہو گا پو پھٹتے

سب کہو قصۂ شبِ ہجراں؟
دیو داروں سے ریگزاروں سے
کوہساروں سے آبشاروں سے
کتنی بیتی ہے رات بولو تم
ڈھل گئی رات آؤ؟ سو لو تم

اونگھتے پیڑ
نیند کے ماتے
سہمی سہمی ہر ایک راہ گذار؟

غزلیں

وحید مرزا

منزلوں پر رک جانا موت ہے ارادوں کی
منزلوں سے آگے بھی راستے نکلتے ہیں
وقت کے تقاضوں پر جب نظر نہیں ہوتی
وقت کے گزرنے پر لوگ ہاتھ ملتے ہیں
ہم نے ریگساروں کو یوں سنبھلتے دیکھا ہے
جیسے موج طوفاں میں ناخدا سنبھلتے ہیں
ہم کو اپنی آنکھوں پر اعتماد ہے لیکن
آستین کے اندر سانپ پھر بھی پلتے ہیں

سعادت نظیر

محرومِ روشنی ابھی شہرِ حیات ہے
دن تو نکل چکا ہے مگر پھر بھی رات ہے
فکرِ معاش، تلخیٔ دوراں، غمِ فراق
یہ زندگی کا سلسلۂ حادثات ہے
یوں سرگذشت اپنی سنائی نظیر نے
ہر دل پکار اٹھا کہ مری واردات ہے

مظہر کامل

چشمِ بیمار کی گفتار سمجھ لیتے ہیں
ہم تجھے اے لبِ اظہار سمجھ لیتے ہیں
وہ جو آداب محبت سے نہیں ہیں واقف
دولتِ غم کو دلِ آزار سمجھ لیتے ہیں
منزلِ عشق کی باتیں ہی انوکھی دیکھیں
بکنے والے کو خریدار سمجھ لیتے ہیں

حامد چھپروی

امداد امام اثر کی تنقید نگاری

بہار میں تنقید نگاری کی روایت بہت قدیم ہے۔ یہاں بھی تنقید نگاری کا آغاز شعراء کے ان اشعار سے ہوتا ہے جس میں انھوں نے اصول شاعری اور شعر کے متعلق اپنے خیالات ظاہر کئے ہیں جس طرح دکن میں وجہی اور شمالی ہند میں فائز کے یہاں ایسے اشعار ملتے ہیں جن میں ان کا تنقیدی شعور جلوہ گر ہے اسی طرح بہار میں بھی راسخ اور جوہری کے یہاں تنقیدی شعور کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ راسخ پر تحقیق کے سلسلے میں جو کلیات دستیاب ہوا ہے اس میں انھوں نے جا بجا اپنے اشعار پر خود اصلاح دی ہے۔ اس سے کلیم الدین احمد نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ان کے اندر تنقیدی شعور تھا۔ اور یہ حقیقت بھی ہے۔ دراصل اعلیٰ خالق بالعموی ناقد فن بھی ہوتا ہے۔ عمل تخلیق کے وقت اس کے ذہن میں تنقیدی قدریں بھی موجود رہتی ہیں اور وہ انھیں کے مطابق اپنے فن کی تراش خراش کرتا ہے۔ راسخ کا اپنے اشعار پر خود اصلاح دینا اس بات کی دلیل ہے کہ ان کے اندر تنقیدی شعور تھا۔ اسی طرح بہار کے مشہور شاعر جوہری کے یہاں بھی اس قسم کے چند فقرے مل جاتے ہیں۔

لیکن باضابطہ طور پر بہار میں تنقید نگاری انیسویں صدی کے اواخر میں ابھری جس میں چار شخصیتیں اہم ہیں، شہباز، امداد امام اثر، نصیر حسین خیال اور صفیر بلگرامی۔ اس کے علاوہ بھی کچھ لوگ نظر آتے ہیں جو گرچہ تنقید نگاری کی دنیا میں کوئی اہم مقام حاصل نہ کر سکے لیکن ان کے تنقیدی کارنامے بہر کیف یاد رہیں گے۔ فضل حق آزاد بھی انھیں لوگوں میں ہیں۔ گرچہ آزاد نے کوئی مستقل کتاب نہیں لکھی ہے لیکن انھوں نے اصولی بحثیں پیش کی ہیں جو اہم ہیں۔ اس لئے ان کے ذکر کے بغیر بہار کے تنقید کی تاریخ نامکمل رہ جائے گی۔ بہار کی تنقید نگاری میں ایک جہت سے شوق نیموی کی بھی لسانی اہمیت ہے۔ انھوں نے جلال لکھنوی کے رسالے کی بنیاد پر زبان و بیان کے متعلق بحث کی ہے۔ اس طرح اگر دیکھا جائے تو لسانی بحث کرنے والے ناقدین دہلی میں حالی، لکھنؤ میں ناسخ اور جلال، اور عظیم آباد میں شوق نیموی نظر آتے ہیں۔ غرضیکہ بہار کی تنقید نگاری میں شہباز، امداد امام اثر، نصیر حسین خیال، صفیر بلگرامی، فضل حق آزاد اور شوق نیموی، یہی چھ شخصیتیں اہم نظر آتی ہیں۔ یہ بات بھی دلچسپ ہے کہ یہ تمام حضرات ناقد بھی ہیں فن کار بھی اور محقق بھی۔

پروفیسر شہباز نے اردو میں غالباً سب سے پہلے کسی ایک شخص پر پوری تنقیدی کتاب لکھی۔ یہ کتاب نظیر اکبرآبادی پر ہے۔ نظیر جس کی عظمت عہد جدید کے نقادوں نے محسوس کی، شہباز بہت پہلے اس بے مثال فن کار کی عظمت کو پہچان گئے تھے۔ نظیر پر انھوں نے تحقیقی کام بھی کیا ہے جن باتوں کے متعلق تاریخ خاموش تھی ان کا علم انھوں نے اس کے کلام سے اجاگر کیا۔ اس سے ایک اور بحث کا آغاز ہوا کہ فن میں فنکار کی شخصیت جلوہ گر ہوتی ہے۔ زندگانی بے نظیر کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شہباز کو یہ احساس تھا کہ فن، فنکار اور عصر فنکار میں کتنا گہرا رشتہ تعلق ہے۔ ساتھ ہی وہ یہ بھی جانتے تھے کہ فن کار کی شخصیت کے متعلق معلومات اس کے کلام کے اندرونی شواہد سے حاصل کی جا سکتی ہے۔ انھوں نے اکثر و بیشتر انگریزی کے حوالے بھی دئے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مغربی طریقۂ تنقید سے بھی واقف تھے۔ لیکن وہ کہیں بھی مغربیت کے شکار نہیں ہوئے ہیں۔ دراصل انھوں نے مغربی طرز تنقید اور مشرقی اصول تنقید کا امتزاج پیش کیا ہے۔ اسی لئے انھوں نے اصول فن بھی پیش کئے ہیں۔ شہباز کو فن کی ہیئت کا بھی احساس تھا۔ چنانچہ انھوں نے اس حیثیت سے نظیر کی شاعری پر اعتراضات کئے ہیں۔ شہباز نے نظیر کی ایمائیت و رمزیت کا بڑا گہرا تجزیہ کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ نظیر کو سب سے پہلے شہباز ہی نے سمجھا۔ دراصل وہ ثابت کرتے ہیں تنقید کا کام تخلیق کے ساتھ ساتھ چلتا ہے اور تنقیدی عمل تخلیقی عمل ہے۔ شہباز حالی سے بھی متاثر تھے اور نظیر سے بھی، جس کا اثر ان کے کلام پر پڑا ہے۔ تعلیمی اثرات کے لحاظ سے وہ علی گڑھ سے بھی متاثر ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ بہار تنقید نگاری میں بھی علی گڑھ سے متاثر ہے۔ خصوصاً حالی نے بہار کی تنقید نگاری کو بہت حد تک متاثر کیا ہے۔ اور شاید یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ شہباز نے سب سے پہلے نظیر کو دریافت کیا۔ بہرحال انگریزی ادب کے اثر سے تنقید نگاری کی جو لہر ہندوستان میں آئی اور جس کے اثر سے جدید تنقید کا آغاز ہوا وہی لہر شہباز کے یہاں بھی نظر آتی ہے۔ اور ہم صاف طور پر بہار کی تنقید نگاری پر انگریزی اثرات کے پرتو پاتے ہیں صفیر بلگرامی بھی اسی قبیل کی یادگار ہیں۔ محمد حسین آزاد نے انگریزی تنقید کی لالٹینوں کی روشنیوں سے آنکھیں سینکیں اور آب حیات لکھی تو صفیر نے بھی بہار میں جلوۂ خضر لکھی۔ صفیر آزاد سے بھی متاثر تھے۔ انھوں نے بھی آب حیات کی طرح جلوۂ خضر میں ادوار قائم کئے ہیں۔ کہا جاتا ہے جلوۂ خضر آب حیات کا جواب ہے۔ بلاشبہہ شہباز کے بعد صفیر کی کلاسیکی اہمیت ہے۔

نصیر حسین خیال پر بھی آزاد کا اثر ہے۔ گو کہ خیال کی زبان کچھ صاف ہے۔ لیکن صفیر کی زبان آزاد سے بھی زیادہ رنگین ہے۔ صفیر اور خیال وغیرہ لسانی محقق بھی ہیں۔ ان لوگوں نے تاریخیں بھی لکھی ہیں اس سلسلے میں ان لوگوں نے لسانی پہلو پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ نصیر حسین خیال کی تاریخ تو بقول خود مصنف زبان اردو کی داستان ہے۔ چونکہ اس پر داستانی رنگ غالب ہے اس لئے اس کا انداز بیان کافی پر لطف ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ معقول تاریخ لکھنے کا کام خیال نے بڑے اچھے طریقے

سے کیا ہے۔

تنقیدی اعتبار سے ہم شاد کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے۔ "فکر بلیغ" میں انھوں نے انیس اور مونس کے مرثیہ پر تنقید بھی کی ہے اور مرثیہ کے فن پر بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ "شاد کی کہانی میری زبانی" سے شاد کے نظریہ فن پر روشنی پڑتی ہے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ شاد کا شعور تنقید بھی بالغ تھا۔ شبلی کے بعد انیس کی مرثیہ نگاری پر "فکر بلیغ" دوسری کتاب ہے۔ اس میں انیس کے مرثیوں پر شبلی کی کتاب سے زیادہ بحث ہے۔ شاد کے بعد علامہ عظیم نے بھی راسخ پر مضامین لکھے ہیں۔ شہباز کے بعد عظیم نے عصری میلانات کو لانے کی کوشش کی اسی لئے ان کو دور جدید کا علمبردار کہا جاتا ہے۔ یہ ہے بہار میں اردو تنقید کی روایت۔ امداد امام اثر کا مطالعہ بھی اسی پس منظر میں کرنا چاہیے۔

امداد امام اثر نے بہار کے اثرات کو ذہانت کے ساتھ قبول بھی کیا ہے اور ان کی صحت پر بھی نظر ڈالی ہے۔ ہر چند کہ امداد امام اثر کلاسیکی بزرگ ہیں اور اس لحاظ سے ان کے میلانات مغربی نہیں ہو سکتے تھے لیکن اس کے باوجود ان کی تنقید میں اتنے مغربی اثرات ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ کاشف الحقائق دراصل حقیقت شاعری، حقیقت نگاری اور حقیقت ادب کھولنے والی کتاب ہے۔ حالی کی طرح اثر نے بھی مختلف حوالوں کے پیش نظر ادب و فن کا جائزہ لیا ہے۔ اس لحاظ سے کاشف الحقائق مقدمہ شعر و شاعری سے مماثلت رکھتی ہے۔ حالی کے مقدمہ کے بعد یہ دوسری اہم کتاب ہے جو بنیادی مسائل فن اور تنقید سے بحث کرتی ہے۔

کاشف الحقائق ایک عظیم تنقیدی کارنامہ ہے اس کی اہمیت کئی حیثیتوں سے ہے۔ کاشف الحقائق اس دور کی پیداوار ہے جب تنقید کا سرمایہ اردو میں بہت کم تھا۔ حالی اور شبلی ہی دو ناقدین تھے جنھوں نے کچھ قابل ذکر تنقیدی سرمایہ پیش کیا تھا۔ حالی کی حیثیت کلیم الدین احمد نے بھی اس اعتبار سے تسلیم کی ہے کہ انہوں نے بنیادی مسائل شاعری کی وضاحت کی ہے اور جب تک بنیادی مسائل سے بحث نہ کی جائے معیار مقرر نہیں ہو سکتا اور اس کے بغیر تنقید من مانی ہو گی۔ اور سلامتی کی طرف نہیں لے جائے گی۔ اس لیے تنقید کی دنیا میں حالی بلا شک میر کارواں ہیں۔ بنیادی مسائل پیش کرنے کی حیثیت سے امام صاحب کا کاشف الحقائق کی بڑی اہمیت ہے۔ اس میں بنیادی حقائق فن اور ادب سے بحث کی گئی ہے اور یہ نواب امداد امام اثر کا بڑا کارنامہ ہے۔ انھوں نے نہ صرف بنیادی مسائل سے بحث کی ہے بلکہ اس بحث و نظر کے بعد جو معیار شاعری قائم کیا ہے اس کی مثال ادبیات عالم سے دی ہے۔ اس کوشش میں انہوں نے انگریزی، عربی اور فارسی شاعری سے کافی استفادہ کیا ہے۔ کاشف الحقائق میں پیش کردہ معیار فن کا مطالعہ دراصل ادبیات عالم کے معیار فن کا قابل مطالعہ ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے معیار کی ترسیل پیدا ہوئی اور قارئین میں یہ تصور پیدا ہوا کہ ادب و فن کی بنیادی حیثیت آفاقی ہے۔ معیار ادب و فن عالمگیر ہوتے ہیں۔ نواب امداد امام کی یہ ذہنیت قابل داد ہے اور وہ اپنے وقت سے آگے معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے شعور جمال میں جو آفاقیت اور عالمگیریت ہے وہ قیمتی چیز ہے اور فن سے مقامی قدروں کی اہمیت ہوتی ہے لیکن بنیادی قدریں ہمیشہ عالمگیر ہوتی ہیں، اس کا ان کو احساس تھا جس کی انہوں نے عملی مثال دی ہے۔

تیسری چیز جو ہمارے سامنے آتی ہے وہ ترقی پسندانہ ہے ہمارے فن کاروں کو ممکن ہے اس کا احساس رہا ہے لیکن باضابطہ طور پر اہل تنقید نے اس کی وضاحت نہیں کی تھی کہ شاعری دوسرے فنون لطیفہ سے کوئی الگ چیز نہیں۔ معیار و اقدار کے معاملہ میں شاعری مصوری اور دوسرے فنون لطیفہ میں بنیادی قدریں مشترک ہوتی ہیں اردو میں اس مسئلہ کو باقاعدہ طور پر پیش کرنے والوں میں امداد امام اثر کو اولیت حاصل ہے۔ انہوں نے مختلف دلائل سے دکھلایا ہے رنگ و آہنگ، پیکر تراشی وغیرہ کی خوبیاں کس طرح ملتی ہیں اور کس طرح پائی جاتی ہیں۔ ان کے نزدیک شاعری کا ایک پہلو مصوری سے بھی ملتا ہے۔ بنیادی حیثیت سے سارے فنون ایک ہیں لیکن شاعری ایک عطر مجموعہ ہے اس میں مصوری، موسیقی پیکر تراشی، نشیب و فراز، حرکت و روانی کے ذریعے رقص کی کیفیت ملتی ہے۔ غرضیکہ شاعری میں تمام فنون لطیفہ کی خوبیاں ملتی ہیں۔ کاشف الحقائق ایک ایسا آئینہ خانہ ہے جہاں یہ تمام حقیقتیں بے نقاب نظر آتی ہیں۔ گرچہ امداد امام اثر نے اس کی تشریح نہیں کی ہے لیکن انہوں نے اس کی طرح ڈال دی ہے۔

امداد امام اثر نے کاشف الحقائق میں معروضی شاعری اور داخلی شاعری کا فرق بتایا ہے۔ اس سے ان کے فکری میلان کا پتہ چلتا ہے وہ مسائل کا تجزیہ اور تشریح وسیع اور گہرے انداز میں کر سکتے ہیں ان کے یہاں وسعت نظر بھی ہے اور عمق نظر بھی۔ انہوں نے شاعری کی دو قسمیں کی ہیں (۱) بیرون بینی (۲) درون بینی یعنی خارجیت اور داخلیت۔ مغربی ناقدین نے بھی شاعری کی یہی دو قسمیں بتائی ہیں معروضی شاعری میں بیانیہ شاعری مثلاً مثنوی، مرثیہ وغیرہ ہیں لیکن ان میں بھی داخلی زندگی کی پیشکش ہوتی ہے۔ جذبات نگاری یہاں بھی ہے۔ دراصل اعلیٰ شاعری کو ہم ان صنفوں سے الگ نہیں کر سکتے۔ لیکن غالب میلان کے لحاظ سے ہم یہ تفریق کر سکتے ہیں۔ نظیر کے یہاں معروضیت غالب عنصر ہے اور میر کے یہاں داخلیت۔ اسی طرح غزل کے اندر داخلیت زیادہ ہوتی ہے اور مثنوی کا عمومی میلان خارجی ہوتا ہے۔ امداد امام اثر نے اسی طرح غالب میلان کی بنا پر شاعری کی تقسیم کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کامیاب فن میں داخلیت اور خارجیت کا سنگم ہوتا ہے۔ شاعری کے ان تمام پہلوؤں کے متعلق امداد امام اثر کو واقفیت تھی۔

(باقی صفحہ ۹ پر)

مراسلات

انجمن کی کانفرنس کا التوا

اُردو کانفرنس جے پور کو ملتوی کر کے آپ نے ایک صحیح قدم اُٹھایا ہے۔ یہ فیصلہ میری توقع کے عین مطابق ہے۔ درحقیقت موجودہ حالات میں ہر محب وطن کا فرض ہے کہ وہ اپنی پوری توجہ قومی و ملکی مدافعت پر مرکوز رکھے۔ میں اس مستحسن فیصلہ پر آپ کو مبارکباد دیتا ہوں۔ خدا کرے ہم سب مل کر اپنے ملک میں فتح و نصرت اور امن و امان کی فضا پیدا کر سکیں۔

(کوثر چاند پوری۔ بھوپال)

کرپلانی رپورٹ کی حقیقت اور اُسکے مفید بنانے کی صورتیں

جب سے کرپلانی کمیٹی کی رپورٹ کا خلاصہ اخبارات میں چھپا ہے اس کی موافقت اور مخالفت میں مضامین نکل رہے ہیں۔ رپورٹ مذکور کے متعلق بہی خواہان اُردو کے مختلف مضامین ایسے نکلے ہیں جو باہم متضاد ہیں۔ جو لوگ جذبات کی رو میں بہنے کے بجائے حقیقت کی روشنی میں معاملات کو جانچنے کے عادی ہیں وہ بھی تھوڑی دیر کے لئے پس و پیش میں پڑ گئے ہیں۔ آیئے سنجیدگی سے غور کیا جائے کہ حقیقت کیا ہے اور اس رپورٹ کو اُردو کے حق میں کیسے مفید بنایا جا سکتا ہے۔

عـ۱ سب سے پہلے یہ بات ذہن نشین کیجئے کہ ایک مدت کے شور و غل کے بعد اُتر پردیش کی حکومت نے اُردو کی ترویج اور ترقی کا جائزہ لینے اور مفید مشورے دینے کے لئے ایک پندرہ نفری کمیٹی محترم آچاریہ کرپلانی کی صدارت میں اپریل ۱۹۶۱ء میں بنائی تھی جس کے نصف ارکان حسب بیان الجمعیتہ دہلی ہندی کے مصنف اور ادیب ہی نہیں بلکہ ہندی کے زبردست علم بردار بھی ہیں بقیہ ارکان میں مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمن صاحب نور اللہ مرقدہٗ اپنی شدید علالت کی وجہ سے کمیٹی میں گویا شریک ہی نہ ہو سکے، اور اُردو کے مخصوص بہی خواہوں میں حضرت مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی صرف ایک ہی نشست میں شرکت کے بعد مستعفی ہو گئے تھے۔ اور حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب مدظلہ، محترم حیات اللہ صاحب انصاری، کرنل بشیر حسین صاحب زیدی وغیرہ وغیرہ کمیٹی مذکور کی تمام نشستوں میں شریک نہ تھے اس لئے یہ توقع رکھنا کہ اس کمیٹی نے اُردو کی تمام جائز شکایتوں کو دور کرنے کی سفارش کی ہو گی محض عبث ہے۔ البتہ سوچنا یہ ہے کہ اگر اس کمیٹی کی کل سفارشوں کو بالکل ہی رد کر دیا جائے تو اُردو کا معاملہ ایک مدت تک بدستور سابق معلق رہ جائے گا۔ اس لئے مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ صوبہ کے مختلف الخیال مشاہیر اُردو کا ایک فوری جلسہ طلب کر کے رپورٹ مذکور کی مضر اور نقصان دہ دفعات میں مناسب ترمیم کر کے حکومت کے حوالے کر دی جائے اور یہ بتا دیا جائے کہ بغیر ان ترمیمات کے بہی خواہان اُردو اس رپورٹ کو تسلیم نہ کریں گے، اس طرح حکومت کا بار بھی ہلکا ہو جائے گا اور بہی خواہان اُردو کا مقصد بھی حاصل ہو جائے گا۔

عـ۲ بہی خواہان اردو کو جن اہم دفعات پر غور و خوض کر کے ترمیم پیش کرنی ہے انھیں اختصار کے ساتھ درج کر رہا ہوں:۔

(ا) مکتبوں کا نصاب بجائے لوکل باڈیز کے جمعیتہ علماء ہند یا ایسی ہی کوئی جماعت بنائے۔ (ب) اسلامیہ اسکولوں یا اُردو میڈیم اسکولوں میں وہی اساتذہ رکھے جائیں جن کی مادری زبان اُردو ہو۔ (ج) مکتبوں کو جو امداد ملتی ہے وہ نہ ملنے کے برابر ہے اس میں فراخ حوصلگی سے اضافہ کی ضرورت ہے۔ (د) اسلامیہ اسکولوں یا اُردو میڈیم کے اساتذہ کے تقرر اور تنخواہ کا بار حسب دستور سابق لوکل باڈیز پر رہے گا۔ (ہ) پرائمری اسکولوں میں اُردو کی تعلیم کے سلسلے میں ہر درجے میں دس یا پورے اسکول میں چالیس طلبہ ہونے کی قید اگر نہ ہٹائی گئی تو اس سے معتد بہ فائدہ نہ ہو گا۔ (و) جن پرائمری اسکولوں میں شرط مذکور پائی جاتی ہے وہاں بھی اُردو کا انتظام ۹۹ فی صدی نہیں ہوتا اس سلسلے میں وقتاً فوقتاً تحقیقات اور مؤثر کارروائی کی ضرورت ہے۔ (ز) جونیئر اور ہائر سکنڈری اسکولوں میں اُردو کی تعلیم اور ذریعہ تعلیم اُردو صفر کے برابر ہے۔ لہٰذا جہاں اس کا مطالبہ ہو وہاں دونوں کا انتظام ہونا چاہیئے، اور اگر اُردو پڑھنے والے طلبہ کی تعداد پانچ یا اس سے زیادہ ہو تو انتظام لازمی طور پر کیا جائے ورنہ بازپرس ہو گی۔ (ح) سہ لسانی فارمولا ان لفظوں میں پاس کیا جائے کہ انگریزی ہندی کے علاوہ ہندوستان کی کوئی دوسری علاقائی مادری زبان۔ (ط) اُردو میں تربیت یافتہ اساتذہ کا انتظام۔ (ی) عدالتوں اور دفاتر میں اُردو میں لکھی ہوئی درخواستوں کے قبول کرنے کا معاملہ انتہائی مایوس کن ہے۔ اس سلسلے میں موثر عملی اقدام کی شدید ضرورت ہے۔

عـ۳ میرا خیال ہے کہ مندرجہ بالا دس ترمیمات سے بہی خواہان اُردو کی بے چینی کسی قدر کم ہو جائے گی اور اُردو کا بھی کچھ بھلا ہو جائے گا۔

عـ۴ اُردو کے تمام بہی خواہوں، اُردو اخبارات کے مدیر صاحبان سے عموماً اور انجمن ترقی اُردو نیز دیگر اُردو انجمنوں اور جمعیتہ علماء ہند کے ذمہ داروں سے خصوصاً یہ درخواست ہے کہ وہ اس مشورہ پر تبادلۂ خیال کے لئے صورتیں نکالیں تاکہ یہ اہم کام انجام پا سکے۔

(عبدالحنان مظاہری گورکھپوری)

اُردو فوج چین کے مقابلے میں

اُردو ہندوستان کی زبان ہے، اور ہم اُردو بولنے والے پورے ہندوستانی ہیں۔ ہم "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" کا نعرہ لگانے والے ہیں۔ ہم اپنے مقدس وطن کے ایک ذرے پر بھی کسی کو قابض نہیں دیکھ سکتے۔ ہم اپنی مملکت کی حفاظت کے لئے اپنی حکومت کے ساتھ ہیں۔ ہمارے یہاں صرف دیوانِ غالبؔ نہیں کلامِ اقبال بھی ہے: ہم صرف امن کا نعرہ لگانا نہیں، خون آشام تلواروں کا چلانا بھی جانتے ہیں۔ ہم نہرو کے پیچھے چلیں گے مگر اپنی فوج کی اگلی صف میں کھڑے نظر آئیں گے۔ ہم حملہ آوروں کا سر کچل کر رکھ دیں گے۔

(اقبال کرشن)

سکون اور نیمہ

ان اعرابوں کے بارے میں بعض اہلِ علم و نظر کو غلط فہمی پیدا ہو رہی ہے، میں اس کو رفع کرنا چاہتا ہوں۔ سکون اور نیمہ میں بڑا فرق ہے۔ سکون اردو میں کسی لفظ کے درمیان یا آخر میں حرکات کے بعد واقع ہوتا ہے، اور وہ اپنے اگلے حرف کو ملانے کا کام دیتا ہے۔ اس کی علامت کتابت میں (ہ) اور ٹائپ میں (^) ہوتی ہے۔ نیمہ اُردو میں کسی لفظ کے شروع یا درمیان میں آتا ہے۔ اس کا استعمال خاص طور پر اُردو میں نونِ غنہ اور یائے مخلوطی کی صورت میں، سنسکرت ہندی کے سمیکت ویجن (وہ حروف صحیح جو آدھے لکھے جاتے ہیں) اور انگریزی کے (S) سے شروع ہونے والے لفظوں میں ہوتا ہے اور اس کا کام نیمہ والے حرفوں کی آواز کو مدھم ظاہر کرنا ہے۔ اس کی علامت کتابت میں (ں) اور ٹائپ میں (٧) ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ اس کے اظہار میں وقفے کے بجائے سکتہ واقع ہوتا ہے۔ مثلاً: (ب) کو زبردستی پڑھنے کی صورت میں اس کا اگلا بول کچھ بڑھ جاتا ہے اور نیمے کے ساتھ اگلا بول ایک دم گھٹ جاتا ہے۔

(غلام رسول)

[illegible]

بقیہ

امداد امام اثر کی تنقید نگاری

امداد امام اثر حالیؔ سے متاثر تو ہیں لیکن ان کی تنقید حالی کی بازگشت نہیں ہے، انہوں نے صرف انہیں باتوں کو نہیں پیش کیا ہے جن کو حالی پیش کر چکے تھے بلکہ بعض نئی باتوں پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اس طرح وہ نقال نہیں تازہ کار ہیں۔ دروں بینی و بیروں بینی اور شاعری اور مصوری کے رشتہ کو حالی نے نہیں پیش کیا ہے لیکن ان مسئلوں پر امداد امام اثر نے اچھے انداز سے روشنی ڈالی ہے اس لئے اُردو تنقید کی دُنیا میں ہمیشہ حالی کے ساتھ ساتھ اثرؔ کا بھی نام لیا جائے گا۔

کاشف الحقائق کے دوسرے حصے میں بے جا طول کلامی ہے ہر چیز میں توازن ضروری ہے۔ اثرؔ نے مسئلہ کو پیش تو کیا ہے لیکن اس کو اس قدر پھیلا دیا ہے کہ وہ مسئلہ ہی اس وسعت سے گم ہو کر رہ گیا ہے۔ ادبی لحاظ سے کاشف الحقائق کا یہ عیب ہے۔ یہی نقص محی الدین قادری زورؔ کی کتاب روحِ تنقید میں بھی ہے۔ لیکن باایں ہمہ اثرؔ کی ناقدانہ صلاحیتوں سے ہم انکار نہیں کر سکتے اُردو تنقید کی روشوں پر انھوں نے جو الالہ و گل کھلائے ہیں ان کی تازگی اور شگفتگی ہمیشہ برقرار رہے گی۔

جوانوں کے لئے اُردو مصنف کا تحفہ

اُردو کے معروف شاعر کرشن موہن نے نیشنل لائبریری کلکتہ کے لائبریرین کی اپیل پر جوانوں کی تفریح کے لئے اپنی تین تصانیف دل نادان، شبنم شبنم، اور تماشائی کی سو جلدیں، انڈین ریڈ کراس سوسائٹی نئی دہلی کو پیش کی ہیں (بلا معاوضہ) انکی قیمت تقریباً ۵۰۰ روپے ہے۔

برہانپور کا مقامی دفاعی امدادی مشاعرہ

۳ر نومبر ۱۹۶۲ء کو برہانپور کی دفاعی امدادی مشاعرہ کمیٹی کے زیر اہتمام ایک دفاعی امدادی مشاعرہ منعقد ہوا جس کی صدارت جناب وصی الدین عارف الراشدی نے کی۔

مشاعرہ سے قبل حضرت محمود ساز صدر مشاعرہ کمیٹی نے ایک پُر جوش اور مؤثر افتتاحیہ تقریر میں دفاعی امداد کے لئے "مشاعرہ" پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ "اُردو کے معنی "لشکر" ہیں۔ اب یہ اُردو نواز طبقے کا فرض ہے کہ اب وہ اس "لشکر" کو اپنے اشعار سے مسلح کر کے ملک کی دفاع کے لئے پیش کرے۔ حصول آزادی میں اُردو شعراء اور شاعری کی اہم خدمات کا ذکر کرتے ہوئے موصوف نے فرمایا کہ اب جبکہ آزادی حاصل ہو چکی اور آزادی کو چینی حملے سے خطرہ پیدا ہو گیا ہے، اُردو شعراء کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے کلام کے ذریعے لوگوں میں سچا جذبۂ حب الوطنی پیدا کریں اور خود بھی یہ بتا دیں کہ اس نازک موقع پر: ع

ہم قلم چھوڑ کے تلوار اٹھا سکتے ہیں

اس موقع پر حاضرین مشاعرہ سے مبلغ ۳۳۲ روپے قومی دفاعی فنڈ کے لئے جمع کئے گئے اور یہ رقم صدر مقامی، قومی دفاعی فنڈ کمیٹی کی خدمت میں پیش کر دی گئی۔

اختتام مشاعرہ کے بعد بھی کچھ عطیات موصول ہوئے۔ جنہیں مقامی قومی دفاعی فنڈ کمیٹی کو پیش کر دیا جائے گا۔

(غلام جیلانی عاصم سکریٹری دفاعی امدادی مشاعرہ کمیٹی برہانپور)

تمل ناڈ اُردو مجلس

تمل ناڈ اُردو مجلس ترچناپلی کا چوتھا سالانہ جلسہ ۲۸ر اکتوبر کو ہوا صدارت ڈاکٹر امیر الدین احمد صاحب صدر مجلس نے فرمائی۔ اس جلسے میں نئے سال کے لئے عہدیداروں کا انتخاب عمل میں آیا۔ (عبدالرحیم جوہر)

ماہنامہ راوی کا اجراء

پٹنہ۔ ۲ نومبر۔ جناب رئیس حاجزی ایم۔ اے۔ کی ادارت میں ایک ماہانہ رسالہ راوی کا اجرا ہو رہا ہے یہ رسالہ افسانوی ادب کی اشاعت کے لئے مخصوص ہوگا پہلا شمارہ دسمبر ۱۹۶۲ء کا ہوگا جو ۱۵ر نومبر ۱۹۶۲ء کو شائع ہو جائے گا۔

پتہ:- ماہنامہ راوی۔ پٹنہ ۴

رام پور میں جشن شاد عارفی

۳۰ر اکتوبر کو رام پور کے نوجوان اور بزرگوں نے صولت لائبریری کے وسیع لکچر ہال میں شاد عارفی کا جشن منایا۔

سب سے پہلے ایک اعلان کیا گیا کہ پچھلے سال جشن اثر کی جو تقریب منائی گئی تھی اس کا نتیجہ اس دوسرے جشن سے پہلے ہی نکل آیا یعنی لاہور کی مجلس ترقی ادب نے "تذکرۂ شعرائے رام پور" کی اشاعت منظور کر لی ہے۔ پھر حامد علی خاں آف ریوڑی نے کرسی صدارت سنبھالی اور شاد عارفی کے مجسمے کی نقاب کشائی کی۔

مقالہ نگاروں میں وصی اقبال، سلطان اشرف، عابد رضا بیدار، اور خورشید علی خاں شامل تھے۔ مقالوں کے بیچ میں شاد عارفی کی بعض غزلیں اور نظمیں جانی میاں، قیصر عارفی، مسلم صدیقی، دل عارفی، خالق رضا اور ارسطو ظفر نے سنائیں۔ ادارہ نیا خواب کی طرف سے شاد صاحب کی غزلوں کا ایک مختصر سا انتخاب جو نیا خواب نے صولت لائبریری کے تعاون سے شائع کیا ہے، صدر محفل کی خدمت میں پیش کیا گیا۔

پھر یہ اعلان کیا گیا کہ انتخاب شاد کی فروخت سے جو رقم ملے گی اس کی ایک تہائی رقم چینی حملہ آوروں سے جنگ کرنے والے اپنے بھائیوں کی امداد کے لئے روانہ کی جائے گی۔

بزم جیون حیدر آباد

بزم جیون کی ادبی ماہانہ نشست کی صدارت کرتے ہوئے کنول پرشاد شاد اسسٹنٹ سکریٹری محکمۂ اطلاعات آندھرا پردیش نے فرمایا کہ "طرحی مشاعروں کی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن کبھی کبھی ہماری ادبی و شعری انجمنوں کے زیر اہتمام موضوعاتی مشاعروں کا انعقاد بھی ہونا چاہئے۔ غزل کا دامن بہت کشادہ ہے۔ صنف غزل میں ہر قسم کے مضامین سموئے جا سکتے ہیں لیکن شعراء کو نظموں کی جانب بھی توجہ کرنی چاہئے آج ملک کے سامنے بڑے بڑے مسائل ہیں۔ موضوعات کی کمی نہیں۔ آج کی اس ادبی محفل میں کافی اہل ذوق حضرات شریک ہیں۔ اس قسم کی شائستہ و شستہ ادبی نشستیں ہماری روایتوں کو تازہ کرتی ہیں۔"

جمال شریف نے "حضرت خواجہ بندہ نواز کا اردو کلام" کے زیر عنوان ایک مضمون پڑھا، اور اکرام جاوید صاحب نے افسانہ دانا دیوار سنایا جو بے حد پسند کیا گیا۔

(فیض الحسن خیالی)

بقیــــــــــــہ

یہ چند ہم عصر

گذشتہ ۱۹۰۰ء میں امیر صاحب کا انتقال حیدرآباد دکن میں ہوا ان دنوں راقم بھی حیدرآباد میں موجود تھا۔ بنارس میں حضور نظام نے منشی صاحب کو حیدرآباد آنے کا ایما فرمایا تھا۔ جب منشی صاحب بھوپال پہنچے تو بعض عوارض کی شکایت تھی۔ جناب نواب شاہجہاں بیگم صاحبہ والیٔ سابق بھوپال نے چار ہزار روپیہ پیش کش کئے اور چندروز اپنے آراستہ باغ میں مہمان رکھا۔ اور فرمایا کہ اب آپ یہیں رہیں کہیں نہ جائیں۔ مگر موت کی کشش کا روکنے والا کون تھا۔ آخر کار حیدرآباد تشریف لے گئے اور حضور کے ایما سے جناب داغ کے مہمان ہوئے اور چند روز بعارضۂ تپش مبتلا رہ کر انتقال فرمایا۔

اوج

میرزا دبیر لکھنوی خاقانی اردو کے فرزند رشید میرزا اوج سلمہ اللہ تعالیٰ مرثیہ گوئی میں اپنے مشہور باپ کے نامور بیٹے ہیں۔ میرزا اوج کے کلام میں متانت رہی ہے جوان کو جناب میر مغفور سے وراثتاً پہنچی اور کلام کی بندش میں صفائی خاص ان کی طبع زاد ہے۔ راقم نے حیدرآباد میں نواب فیاض علی خاں صاحب کی آراستہ و پیراستہ مجالس میں میرزا اوج کو تحت اللفظ پڑھتے سنا ہے جہاں تمام حیدرآباد کے امراء و اکابر جمع ہوتے تھے اور ہر بند پر صل علیٰ و سبحان اللہ کے نعرے بلند ہوتے تھے۔

فصیح الملک نواب میرزا داغ

جناب داغ کی تعریف مستغنی عن البیان ہے۔ دوسرے حضور نظام حیدرآباد کی اُستادی اور پندرہ سو روپیہ ماہوار کی ملازمت نے ان کو سب تعریفوں سے بے نیاز کر دیا تھا۔ جناب داغ کے تین دیوان ہیں اور سُنتا ہوں کہ چوتھا دیوان بھی نکل چکا ہے لیکن جناب داغ کی شاعری کا دلچسپ اور بہترین نمونہ پہلا دیوان موسوم بہ گلزار داغ ہے داغ کے کلام کی سادگی میں اداے کلام وہ مزا دے جاتی ہے جو داغ اور صرف داغ کا حصہ ہے۔ اور موجودہ زمانہ کا سلیس اور سادہ مذاق غزل کے لئے داغ کی زبان اور داغ کے انداز بیان کی نسبت خاص دلچسپی ظاہر کرتا ہے اور اسباب ہیں داغ کو جو بات حاصل ہوگئی ہے وہ عام مذاق پر اثر ڈالنے والی ہے اور تمام ہندوستان کی محفلوں اور عیش و نشاط کے جلسوں میں جتنی غزلیں داغ کی گائی جاتی ہیں کسی کی نہیں گائی جاتیں۔

جناب داغ خواجہ ابراہیم ذوق کے شاگرد رشید ہیں۔ دلی سے نکل کر نواب کلب علی خاں فرمانروائے رام پور کی قدردانی سے دربار رام پور میں جگہ پائی اور نواب خلد آشیاں کے بعد تقدیر کی یاوری نے حیدرآباد پہنچا کر حضور نظام کا اُستاد بنا دیا۔ جب جناب داغ حیدرآباد کو تشریف لے گئے تو راقم وہاں موجود تھا، اور خدا بخشے مولوی سیف الحق صاحب ادیب دہلوی نے مجھ کو اُن سے ملایا تھا۔

مولانا حالی

مولانا خواجہ الطاف حسین صاحب قصبہ پانی پت کے متوطن ہیں مگر ساری عمر دلی کی صحبتوں میں گزری۔ خواجہ ابراہیم ذوق، حکیم مومن خاں، مولوی امام بخش صاحب صہبائی، مفتی صدرالدین خاں صاحب، نواب علاءالدین خاں رئیس لوہارو، میرزا اسد اللہ خاں غالب جیسے ادباء و شعرائے کاملین کی ہم بزمی کا موقع پایا۔ مولانا حالی کی شاعری دو حصوں میں منقسم ہے۔ ایک وہ جو ان کے دیوان میں پائی جاتی ہے جو شاعری کا نمونہ ہے دوسرے وہ جس کو زمانے کے مذاق اور ابناء زمانہ کی سخن فہمی کا اندازہ کر کے انھوں نے اختیار کیا۔

میں ادب کے مقام میں کچھ بولنا نہیں چاہتا۔ مگر مجھ کو اپنی طبیعت اور اپنی رائے کا اختیار ہے۔ میں ان کے طرز قدیم کو شاعری جانتا ہوں اور دوسرے طرز کو نظم اور صرف نظم۔ مولانا حالی کا دماغ من حیث شاعری کے اکثر دماغوں سے زیادہ روشن ہے جس کے گروں میں زمانہ شمع کافوری کی جگہ گیس آئل کی روشنی پسند کرتا ہے۔ ؎

کیوں جل گیا نہ تاب رُخ یار دیکھ کر
جلتا ہوں اپنی طاقتِ دیدار دیکھ کر

مولانا حالی کی تصنیف شریف اور تالیف لطیف سے سرسید احمد خاں کی لائف حیات جاوید، دیوان حالی، مسدس جزر و مد، یادگار غالب، حیات سعدی۔ اور متعدد نظمیں اردو کی دنیا میں بقائے زبان تک اپنی یاد قائم رکھنے والی ہیں۔ راقم کو کئی مرتبہ مولانا سے حصول نیاز کا موقع ملا ہے۔ اب سن شریف ساٹھ سال کے قریب ہوگا۔ مولانا حالی پُرانی وضع کے ایک ایسے قابل بزرگ ہیں جو علم اور شاطبقی میں نُو کے ہندسہ کی طرح کبھی اپنی وضع نہیں چھوڑتے۔

ریاض خیرآبادی

منشی ریاض احمد ریاض خیرالبلاد خیرآباد کے متوطن ہیں، جس سرزمین سے بڑے بڑے نامور عالم فاضل شاعر پیدا ہو چکے ہیں اور ابھی تھوڑے زمانہ پہلے تک مولانا فضل حق اور ان کے بعد ان کے نامور بیٹے مولانا عبدالحق علامہ روشناس عالم تھے۔ شاعرانہ مذاق میں بھی خیرآباد کا نمبر بہت بڑھا ہوا ہے۔ ریاض، مضطر، وسیم جیسے رعنا خیال اور کہاں نظر آتے ہیں۔ جناب ریاض حضرت امیر مینائی کے شاگرد رشید ہیں۔ لیکن انداز بیان میں فصیح الملک داغ کے ساتھ چلنا چاہتے ہیں۔ ریاض کی طبیعت غزل کے حقیقی معنی سخن با محبوب گفتن کو خوب سمجھے ہوئی تھی۔ ریاض کی ترکیب اور ادا بندی سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ داغ کی طرح بزم محبوب میں پوری رسائی رکھتے ہیں، اور وہ جو کچھ لکھتے ہیں ایک گذری ہوئی کیفیت کا نمونہ ہوتا ہے۔ ریاض کے استعارہ کی رنگینی خاص قسم کی ہے، اور ریاض کی نثر میں ایک خاص رعنائی ہوتی ہے علاوہ جو لوگ ان آوازوں پر کان لگائے

رہتے ہیں وہ ریاض کی نظم و نثر سُن کر کہہ سکتے ہیں کہ ہو نہ ہو، ریاض کی سی آواز ہے۔

مضطر

جناب مضطر سے میرا تعارف نہیں مگر اتنا جانتا ہوں کہ وہ نواب ابراہیم علی خاں بہادر رئیس ٹونک کے ہوا خواہ اور مصاحب خاص ہیں، اور ان کا نہایت دلچسپ اور دل پر اثر ڈالنے والا کلام مختلف گلدستوں میں دیکھا ہے اور اس کلام سے موضوعات قابل قدر کا پتہ چلتا ہے جو اُردو کی شاعری کا بہترین نمونہ سمجھا جاتا ہے۔

شوکت

حسان الہند مولانا شوکت نزیل میرٹھ میدان مناظرہ میں مرد اور اپنی ژرف نگاہی اور بہتایت خیال میں جوہر فرد ہیں اخبار طوطیِ ہند اور شحنہ اور رسالۂ پروانہ اُن کے مقالات شاعری کی شاہراہ اور اُن کے خیالات رفیعہ کے جولانگاہ ہیں۔ ہمارے فاضل مخدوم نے متنبی، خاقانی، غالب کے اشعار کا جو حل کیا ہے وہ اُردو کی لائبریری میں بہت بڑی عزت سے جگہ پانے کے قابل ہے۔

منیر شکوہ آبادی

منشی اسمٰعیل منیر شکوہ آبادی کی استعداد علمی کو فاضلانہ درجہ حاصل ہے۔ غدر ۱۸۵۷ء کی کر تقریبے جا میں پکڑ کر کالے پانی بھیج دیے گئے تھے۔ اور مولانا فضل حق خیرآبادی کو بھی وہاں بھیجا گیا تھا۔ مولانا فضل حق نے کہا کہ اردو میں عربی کی گنجائش نہیں اور عربی کا ایک قصیدہ پڑھا۔ منیر نے اسی جوڑ کا قصیدہ اُردو میں لکھا جو اُن کے کلیات میں موجود ہے۔ نواب کلب علی خاں بہادر فرمانروائے رامپور کی قدردانیوں سے امیر، داغ، جلال، منیر شاعری کے اربعہ عناصر بنے ہوئے تھے۔ منیر کی شاعری کا مذاق سب سے علیٰحدہ ہے۔ منیر کی شاعری سے ہندوستان کے مذاق کا اندازہ ہوتا ہے۔ منیر کی قدرت کلام کا اندازہ بغیر اس کے نہیں ہو سکتا کہ اُن کے کلیات کو دیکھئے جو ایک مرتبہ چھپ کر کمیاب ہو رہا ہے۔ منیر انتہا کے خوش بیان تھے۔ اُن کی باتوں میں عجیب دلربائی تھی۔ راقم نے منیر کو ان کی آخر عمر میں دیکھا ہے جب کہ ان کا سن ساٹھ برس سے زیادہ ہو چکا تھا۔ مگر منیر کی شگفتہ مزاجی اُن کو جوان بوڑھوں میں یکساں محبوب بنائے رکھتی تھی۔

قلق

جناب آفتاب الدولہ قلق کو میں نے اس وقت دیکھا تھا جب کہ وہ آفتاب لب بام ہو رہے تھے۔ قلق کا شمار اُردو کے خاص شاعروں میں ہے۔ اور قلق کا دیوان اور اُن کی مثنوی طلسم اُلفت ان کی یادگار ہے۔

خلیل الرحمٰن اعظمی

تبصرے

تماشائے اہلِ ہنر

مصنف: سید رشید الحسن ایم اے

ناشر: ادارۂ ادبیات اُردو، حیدرآباد دکن۔ قیمت ۱٫۵۰

یہ مجموعہ ہے تین ڈراموں کا جو اُردو کے تین اہم شعرا یعنی غالب، مومن اور اقبال پر لکھے گئے ہیں۔ یہ ڈرامے شعرا کی شخصیت، فن اور اُن کے سماجی کردار کا مطالعہ اور تجزیہ کرنے کے بعد تیار کئے گئے ہیں اور ان میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انھیں لکھتے وقت اسٹیج کی ضروریات کا پورا پورا خیال رکھا گیا ہے۔ حیدرآباد کے بعض کالجوں میں یہ ڈرامے کامیابی کے ساتھ اسٹیج کئے جا چکے ہیں اور مصنف کی اجازت سے دوسری جگہوں پر بھی انھیں پیش کیا جا سکتا ہے۔ اُردو میں اس نوع کے ڈرامے بہت کم ہیں، رشید الحسن صاحب نے ان ڈراموں کو لکھ کر ایک اہم خدمت انجام دی ہے۔

یادگارِ امجد

مرتب: محمد اکبر الدین صدیقی

ناشر: مکتبۂ ابراہیمیہ، حیدرآباد دکن۔ قیمت ۱٫۵۰

حضرت امجد حیدرآبادی مرحوم اُردو کے باکمال رباعی گو شاعر تھے۔ مارچ ۱۹۶۱ء میں ۹۲ سال کی عمر پاکر رحلت کی۔ ان کی وفات پر مولانا مناظر احسن گیلانی، حضرت جوش ملیح آبادی، ڈاکٹر محی الدین قادری زور، پروفیسر سید محمد اور ڈاکٹر عبدالصمد وغیرہ نے تفصیلی مضامین لکھے تھے جن میں مرحوم کی شخصیت اور فن سے متعلق اپنے تاثرات ظاہر کئے ہیں۔ جناب اکبر الدین صدیقی نے یہ مضامین نیز دوسرے مختصر تاثراتی مضامین، تعزیتی پیغامات اور منظوم تاثرات کو یکجا کر دیا ہے۔ تصانیفِ امجد اور حالاتِ امجد پر خود بھی بھرپور معلوماتی مضامین لکھے ہیں۔ یہ مختصر کتاب حضرت امجد پر ایک عمدہ تعارفی تنقید اور قدردانانِ امجد کے لئے ایک قابل قدر تحفہ ہے۔

سندھ کے جدید اُردو شعراء

مصنف: مشتاق علی جعفری

ناشر: ظہیر اینڈ سنز، حیدرآباد سندھ۔ قیمت ۵٫۵۰

جناب مشتاق جعفری نے یہ مقالہ ایم اے فائنل کے امتحان کے لئے تیار کیا تھا۔ اس کتاب میں ان تمام شعرا کا ذکر ہے جو اس وقت علاقۂ سندھ پاکستان میں رہتے ہیں اور اردو میں شعر کہتے ہیں۔ بعض شعرا وہیں کے باشندے ہیں، بعض مہاجر ہیں۔ مرتب نے ان سب کا کلام اور ان کے حالات اکٹھا کئے ہیں اور اس سلسلے میں خاص تگ و دو کی ہے۔ ابتدا میں ۴۳ صفحات کا ایک مقدمہ ہے جس میں نہایت تحقیق و جستجو کے بعد سندھ کا اُردو سے قدیم تعلق تلاش کیا گیا ہے اور وہاں کے اُردو ادیبوں اور شاعروں کی سرگرمیوں کو اجمالاً بیان کیا گیا ہے۔ بعض اہم شعراء کی تصویریں بھی اس کتاب میں شامل کر دی گئی ہیں۔

پبلشر نذیر حسن پرنٹر ظہیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھپوا کر مرکزی انجمن سے شائع کیا